افکارِ تازہ اور اقبالؒ

Iqbal and the Philosophy of Fresh Thought

Dr. Khizra Tabassum
Assistant Professor of Urdu, LCWU, Lahore
khizraatabassum@gmail.com

Abstract:
This research explains the central and basic role of “fresh ideas” in the rise and fall of great civilizations, with primary focus on Allama Iqbal’s philosophy. History reminds that great nations do not achieve greatness by just wealth, architecture, or power, but through modern and innovative thinking and higher intellect. The example of Baghdad’s *Bayt al-Hikmah* shows how the translation of Greek philosophy, Indian mathematics, Persian medicine, and Roman engineering developed a new world of wisdom and knowledge. Yet, when intellect vanished, the city’s enormous buildings and libraries could not protect it from the undoubted decline. The fall of Baghdad symbolized how the loss of productive and creative thoughts leads to collapse of civilization. In his poetry, Iqbal explains this historical fact by highlighting the idea that "a new world emerges from fresh thoughts." He contends that countries bind themselves not just by losing wars but also—and perhaps more dangerously—by becoming intellectually and spiritually hopeless. According to Iqbal, the biggest kind of slavery is when individuals blindly trust material powers and give up on God. Both faith and action are weakened by such an attitude. Iqbal's ideology encourages having enough courage to challenge conventional wisdom, question established norms, and turn ideas into action. He emphasizes that ongoing struggle, intellectual regeneration, and spiritual fortitude are necessary for true advancement. His perspective blends responsibility and hope: if nations rediscover their identity and creative spirit, any collapse can serve as the foundation for new development. The analysis comes to the conclusion that Iqbal's teachings are still very applicable today. Muslim societies are unable to rely on their past greatness or outside assistance in a world that is changing quickly due to technology. Regaining intellectual freedom, reviving creative thought, and fostering faith in divine direction are all necessary for a true rebirth. New concepts continue to be the cornerstone of vibrant nations because they stimulate both personal growth and group change.

Keywords: Allama Iqbal, Fresh ideas, Bayt al-Hikmah, Mulim Societies

وہ شہر علم کی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ گلیاں صرف پتھروں اور اینٹوں سے نہیں بنی تھیں، بلکہ ہر در و دیوار سے فکر کی خوشبو آتی تھی۔ یہ بغداد تھا، وہی بغداد جو اس زمانے میں کائنات کے نقشے پر علم و حکمت کا دل کہلاتا تھا۔ جہاں چوک و چوراہوں پر علم کے خزانے بانٹے جاتے تھے۔ اس کے وسط میں ایک عمارت تھی "بیت الحکمہ " مگر اسے شان بخشنے والا سنگِ مرمر یا سنہری گنبد نہیں تھا۔ اسے عظمت عطا کرنے والی چیز تھی وہاں بسنے والے ذہن۔ وہ دماغ جو کائنات کو نئے زاویے سے دیکھتے، پرانی حدیں توڑتے، اور نئ دنیا کا خواب بُنتے تھے۔ یہاں آ کر یونان کے فلسفے کو عربی میں سانس ملی، ہند کی ریاضی نے قلم تھاما، ایران کی طب نے نئ راہیں تلاش کیں، اور رومی انجینئرنگ نے فکر کا نیا لباس پہنا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب امتِ مسلمہ نے "جہانِ

تازہ" تعمیر کیا —— اور یہ جہاں اینٹوں یا پتھروں سے نہیں، افکارِ تازہ سے وجود میں آیا۔ لیکن جب یہ چراغِ فکر بجھا، جب علم کی جگہ جمود نے لے لی، تو بلند و بالا مینار بھی قوم کو بچا نہ سکے۔

ہلاکو خان کی تلواروں نے شہر کو روند ڈالا، اور بیت الحکمہ کی لاکھوں کتابیں دریائے دجلہ کے پانی کو سیاہ کر گئیں۔ قدرت کا قانون ہے جب کسی قوم سے کوئی نعمت چھن جاتی ہے تو وہ نعمت کرہ ارض پر کسی نہ کسی کے قدموں میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہی اس وقت ہوا اور علم و حکمت کے گراں قدر خزانے ترک قوم کا مقدر بنے اور جب کئی صدیوں بعد یہ نعمت ترکوں سے بھی لے لی گئی تو انھی ایام میں برصغیر پاک وہند میں اقبالؒ کا اقبالؒ بلند تھا۔ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی فلسفے کو بیان کیا اور صدیوں پر محیط اس کشمکش کا فیصلہ کیا۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا[1]

آگرہ کا تاج محل ہو یا یورپ کی بلند و بالا عمارتیں ہوں یہ کبھی بھی جہانِ تازہ کی دلیل نہیں ہو سکتیں۔ معاشی ترقی تاریخ کے اوراق میں حشر بپا نہیں کر سکتی اور نہ ہی بلند عمارتیں تاریخ میں زندہ رہتی ہیں۔ افکارِ تازہ دراصل انسانی روح کی تازگی اور ذہن کی بیداری کا دوسرا نام ہیں۔ جس قوم کے اذہان جمود کا شکار ہو جائیں، وہاں کتابیں صرف برائے زینت رہ جاتی ہیں، اور علم محض ماضی کی یادگار۔ لیکن جب کسی دل و دماغ میں سوال اٹھتا ہے، جب وہ پرانے سانچوں کو توڑنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، تو یہی لمحہ ایک نئی دنیا کے جنم کی نوید ہوتا ہے۔ افکارِ تازہ وہ چراغ ہیں جو اندھیروں میں راستہ دکھاتے ہیں۔ یہی وہ قوت ہے جو ریگزاروں میں سبزہ اگا دیتی ہے اور پتھروں میں سے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ یہ افکار ماضی کی شکست وریخت سے گھبراتے نہیں بلکہ اسی شکست کو ایک نئے تعمیر کا نقطۂ آغاز بنا لیتے ہیں۔ یہی وہ راز ہے جسے اقبالؒ نے اپنی شاعری میں بار بار دہرایا۔ کہ دنیا کی حقیقی تعمیر اینٹ اور گارے سے نہیں بلکہ زندہ افکار سے ہوتی ہے۔

اقوامِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ جب افکارِ تازہ نے کسی دل و دماغ کو چھوا تو محض جغرافیہ ہی نہیں بدلا بلکہ وقت کا دھارا بھی بدل گیا۔ یہی سوچ تھی جس نے بکھرے ہوئے قبیلوں کو ایک امت میں ڈھالا، اور یہی فکر تھی جس نے صحرا نشینوں کو تہذیب و تمدن کا رہنما بنا دیا۔ افکارِ تازہ وہ قوت ہیں جو انسان کو تقدیر کے بند حصار سے نکال کر عمل کے افق تک لے جاتی ہیں۔ یہ فکر انسان کو ماضی کی شکست وریخت سے اوپر اٹھا کر مستقبل کی تعمیر کا راستہ دکھاتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک یہی زندہ فکر ہے جو غلامی کے اندھیروں کو مٹا کر آزادی کی سحر کو جنم دیتی ہے، اور یہی وہ روشنی ہے جو زمانے کی تاریکیوں میں مشعلِ راہ بن کر ابھرتی ہے۔ اقبالؒ کی تازہ فکر حقیقت سے ناآشنا نہیں تھی جس کی دلیل اقبالؒ کا یہ شعر ہے:

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے ناامیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟[2]

اقبالؒ اپنے ہم عصروں کو متنبہ کرتے ہیں کہ اصل غلامی تلوار یا توپ کے زور سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس وقت جنم لیتی ہے جب کوئی قوم اپنی فکری اور روحانی آزادی کھو بیٹھتی ہے۔ "بتوں سے امیدیں" دراصل اس ذہنیت کی طرف اشارہ ہے

جس میں مسلمان اپنی طاقت کے سرچشمے کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے جھکنے لگتے ہیں، خواہ وہ طاقتور اقوام ہوں، سرمایہ ہو یا محض مادی وسائل۔اس کے برعکس "خدا سے ناامیدی" اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے اصل مرکزِ یقین کو بھلا بیٹھا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ سب سے بڑی غلامی ہے کیونکہ جب کوئی قوم اپنے رب کی ذات سے امید توڑ دیتی ہے تو پھر وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔یہی وہ کیفیت ہے جو فکر کو مفلوج اور عمل کو بے جان کر دیتی ہے۔

غلامی کی سب سے بڑی شکل یہ ہے کہ انسان اپنی امیدیں دوسروں کی طاقت اور مادی قوتوں سے وابستہ کرے اور اپنی اصل سہارا دینے والی قوت، یعنی خدا کی ذات سے ناامید ہو جائے۔ یہاں "بت" محض پتھر کے معبود نہیں بلکہ مغربی تہذیب، طاقتور اقوام اور مادی تصورات ہیں جن پر مسلمان اندھا اعتماد کرنے لگے، جبکہ اپنی روحانی اور فکری آزادی کھو بیٹھے۔ اقبال کے نزدیک خدا سے ناامیدی ناصرف ایمان کی کمزوری اور فکر کے جمود کی علامت ہے، بلکہ اعتقاد پر ضرب کے باوجود ایک غیر یقینی عمل ہے اور یہی ذہنی غلامی قوم کو حقیقی بیداری سے محروم کر دیتی ہے۔

اس تناظر میں اقبالؒ کا یہ پیغام آج بھی اتنا ہی تازہ ہے جتنا ان کے زمانے میں تھا۔ وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ حقیقی قوت کا سرچشمہ بیرونی طاقتوں کی خوشامد یا ان کے عطا کردہ نظام نہیں، بلکہ اپنی داخلی خودی، ایمان اور فکری تازگی ہے۔ جب قوم اپنی امیدوں کو دوبارہ خدا کی ذات سے جوڑ لیتی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو غلام نہیں بنا سکتی۔ قوم اپنے زندہ یا مردہ ہونے کا ثبوت اپنے افکار و عوامل دیتی ہے، اسی بات کو اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں[3]

اقبالؒ کا کلام در حقیقت انہی افکارِ تازہ کی ترجمانی کرتا ہے جو قوموں کو جمود اور ٹھہراؤ سے نکال کر حرکت اور تجدید کی راہ دکھاتے ہیں۔ زندہ قوموں کی پہچان یہ ہے کہ وہ حالات کے جبر کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتیں بلکہ ہر شکست کو نئی تعمیر کا نقطۂ آغاز بنا لیتی ہیں۔ اُن کے افکار ایسے چراغ ہوتے ہیں جو اندھیروں کو روشنی میں بدل دیتے ہیں اور ہر نئے دن کو امکانات کی ایک تازہ صبح میں ڈھال دیتے ہیں۔اقبالؒ کے کلام میں زندہ قوموں کے لیے ہمیشہ ایسی نشانیاں بتائی گئی ہیں جس کے ذریعے وہ ثابت کرتے ہیں کہ قومیں اپنی تقدیر اور مستقبل کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کے نزدیک حقیقی زندگی تغیر اور ارتقا کا نام ہے۔ جو قومیں فکرِ تازہ کو اپنا سرمایہ بناتی ہیں اُن کی تقدیر ایک جگہ جمود کا شکار نہیں رہتی، بلکہ وہ ہر صبح و شام نئے امکانات، نئے خواب اور نئی حقیقتیں تخلیق کرتی ہیں۔ یہ تغیر ان کے زوال کو بھی عروج کا زینہ بنا دیتا ہے، اور یہی ان کی اصل شناخت ہے کہ اُن کی تقدیریں جامد نہیں بلکہ متحرک رہتی ہیں۔اقبالؒ کی شاعری میں قوم کی تعمیر کا جو کلیہ ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی تعمیر مادی اشیاء سے نہیں بلکہ زندہ افکار سے ہوتی ہے، اور زندہ افکار قوموں کی تقدیر کو پلک جھپکتے ہی بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے افکارِ تازہ کو جنم دیا، وہ قوم زمانے کی رہبر بن گئی۔ یونانی فلسفیوں کے سوالات نے علم و حکمت کی بنیاد رکھی، مسلمانوں کی فکری جرات نے اسے آسمان تک پہنچا دیا، اور بعد ازاں یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) نے انہی افکار کو آگے بڑھا کر ایک نئے عہد کی شروعات کی۔اقوام کو یہ بامِ عروج یوں ہی نصیب نہیں ہوتے بلکہ اس کے پیچھے عملِ پیہم کارفرما ہوتا ہے۔اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوب فطرت ہے[4]

افکارِ تازہ محض خیالات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ یہ سوچ کو حرکت میں بدلنے کا ہنر ہے۔ جس قوم میں یہ جرات باقی ہو کہ وہ مروجہ اصولوں پر سوال اٹھائے، پرانے سانچوں کو توڑے، اور نئی دنیا کا خواب دیکھے، وہی قوم زندہ رہتی ہے۔ ورنہ وہ صرف اپنے ماضی کے مزاروں کی مجاور بن کر رہ جاتی ہے۔ آج اگر ہم اپنے حال پر نظر ڈالیں تو ہمیں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہی "افکارِ تازہ" ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی، نئی سائنس، نئے معاشرتی اصول، یہ سب اسی وقت ہمارے حصے میں آ سکتے ہیں جب ہمارے نوجوان سوچنے کی جرات کریں، سوال اٹھائیں، اور پھر اس سوال کو عمل میں ڈھالنے کا حوصلہ رکھیں۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا کہ جہاں تازہ افکار سے وجود میں آتے ہیں، نہ کہ سنگ و خشت سے۔ دنیا کی حقیقت افکار ہیں اور ان ہی کے بطن سے تمدن، تہذیب، سیاست اور معیشت سب کچھ جنم لیتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک خودی پر مضبوط یقین اور اور تسلسل سے کیا جانے والا عمل مردِ مؤمن کی اساس ہے۔

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں[5]

یہ عنوان یہاں تک محدود نہیں کہ اقبالؒ نے صرف جہانِ تازہ کی نمود کو افکارِ تازہ سے جوڑ دیا بلکہ اس کے پیچھے اقبالؒ کا وہ فلسفہ، سیاسی اور فکری شعور ہے جو اس زمانے میں بہت کم اشخاص میں پایا جاتا تھا۔ اسی شعور کی گرہیں مزید کھولتے ہوئے اس وقت کے حالات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اقبالؒ کی فکر اُس عہد کی پروردہ ہے جب مشرق اور مغرب دونوں اپنی اپنی نئی کروٹ لے رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کی تاریخ پرانی ساختوں کو توڑ رہی تھی اور نئی بنیادوں پر اپنی عمارت استوار کر رہی تھی۔ سلطنتوں کے زوال اور طاقتوں کی کشمکش نے ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا تھا جس نے نہ صرف سیاسی نقشے کو بدل ڈالا بلکہ ذہنوں اور افکار کی دنیا کو بھی ہلا ڈالا۔ یورپ میں صنعتی انقلاب اور علمی بیداری کی لہر نے ایک نئی تہذیبی قوت کو جنم دیا، جبکہ مشرق اپنی شکستگی اور جمود کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ پرانی دراڑیں گہری ہو رہی تھیں اور نئی طاقتیں اپنے وجود کا اعلان کر رہی تھیں۔ یہ ارتعاش محض کاغذی نہیں تھا بلکہ انسانی دل و دماغ کی رگوں میں گردش کر رہا تھا، اور اقبالؒ جیسا حساس شاعر اس دھڑکن کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ اقبال کی شاعری کے بارے میں سر طاس آرنلڈ کی رائے ہے:

"ہندوستان میں حرکتِ تجدید نے اپنا ممتاز ترین ظہور سر محمد اقبالؒ کی شاعری میں حاصل کیا ہے۔"[6]

انیسویں صدی کے آخری برسوں اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں نے عالمِ اسلام پر غم و یاس کے سائے گہرے کر دیے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ، جو کبھی تین براعظموں میں مسلمانوں کے وقار اور اتحاد کی علامت تھی، اب کمزور ہو چکی تھی۔ ایک طرف داخلی زوال اور سیاسی انتشار نے اسے کھوکھلا کر دیا، تو دوسری طرف یورپ کی فوجی یلغار اور تہذیبی برتری نے اسے مزید بے بس کر دیا۔ قسطنطنیہ کے در و دیوار جو کبھی دنیا کے سب سے بڑے اقتدار کی نشانی تھے، اب خاموش ہو کر وقت کے تغیر کا نوحہ پڑھنے لگے۔ مدارس اور خانقاہوں میں فکر کی روشنی مدھم ہو رہی تھی اور اجتہاد کے چراغ گل ہونے لگے تھے۔ اقبالؒ نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ جب ایک قوم کی فکری قوت ماند پڑ جائے، اس کا شعور سو جائے اور اس کی روح مردہ

ہو جائے تو توپوں کے دہانے اور قلعوں کی فصیلیں بھی اس کے وجود کو سہارا نہیں دے سکتیں۔ یہی احساس اقبالؒ کو اس نتیجے تک لے آیا کہ اصل جنگ ہتھیاروں کی نہیں بلکہ خیالات اور یقین کی ہے۔

دوسری طرف برصغیر کی سرزمین غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ دہلی کا جاہ و جلال، جو کبھی سلطنتِ مغلیہ کا تاج سمجھا جاتا تھا، اب کھنڈرات میں چھپ چکا تھا۔ وہ گلیاں جو کبھی علم و ادب کی روشنی سے جگمگاتی تھیں، اب سنسان اور ویران ہو چکی تھیں۔ ہندوستان کے مسلمان ایک طرف سیاسی اقتدار سے محروم تھے اور دوسری طرف ذہنی و معاشرتی پسماندگی کا شکار۔ ان کے قلوب میں احساسِ کمتری نے ڈیرے ڈال لیے تھے اور ان کی آنکھوں میں مایوسی کے سائے چھا گئے تھے۔ ایسے میں سر سید احمد خان نے اصلاح و تعلیم کی شمع جلائی، جو ابتدا میں مدھم سی روشنی تھی لیکن اس نے سست روی کے اندھیروں کو چیرنا شروع کیا۔ اقبالؒ نے اسی روشنی کو اپنے فکر و فن کے زور سے شعلۂ انقلاب میں بدل دیا۔ ان کے نزدیک محض تعلیمی اصلاح کافی نہیں تھی بلکہ اس تعلیم کو ایسی فکری بیداری میں ڈھلنا چاہیے جو غلام ذہنوں کو آزاد کرے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی آزادی کی حقیقی بنیاد ذہنی آزادی ہے، اور اسی لیے ان کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے کہ مسلمان اپنی فکری زنجیریں توڑیں اور نئے خیالات کو جنم دیں۔

اسی زمانے میں مغرب ایک بالکل نئی دنیا تراش رہا تھا۔ رینیسنس (نشاۃِ ثانیہ) نے صدیوں پر محیط جہالت اور جمود کی دیواریں توڑ ڈالیں۔ کلیسا کے غلبے سے آزاد ہو کر انسان نے کائنات کو نئے زاویوں سے دیکھنا شروع کیا۔ سائنس کی حیران کن ایجادات، فلسفے کی جستجو، سیاسی انقلابات اور صنعتی ترقی نے یورپ کو ایک نئے سفر پر ڈال دیا۔ اقبالؒ نے اس مغرب کو قریب سے دیکھا، وہاں تعلیم حاصل کی، اور براہِ راست محسوس کیا کہ یہ انقلاب محض توپوں، محلات یا سرمایہ داری کی پیداوار نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک زندہ فکر، ایک بیدار ذہن اور اجتہادی روح کار فرما تھی۔ اقبالؒ نے جان لیا کہ طاقت کا سرچشمہ افکارِ تازہ ہیں، اور جب تک امتِ مسلمہ دوبارہ اپنے اندر یہی تخلیقی توانائی پیدا نہ کرے، وہ محض ماضی کی یادوں میں جی کر اپنا مستقبل نہیں بنا سکتی۔ یہی بصیرت انہیں اس نتیجے پر لے آئی کہ اگر مسلمانوں کو پھر سے عروج درکار ہے تو انہیں اپنی جمی ہوئی ذہنی فضا کو توڑنا ہوگا، نئی فکری دنیا تراشنا ہوگی اور اپنی روحانی بنیادوں پر جدید شعور کو استوار کرنا ہوگا۔ لیکن اقبالؒ نے شمع کی لو بجھانے کے بجائے "تازہ افکار" کی بدولت نئی سحر کی تلاش کی بات کی:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا[7]

اقبالؒ کی سحر دراصل افکارِ تازہ ہی ہے۔ تاریخ کے اوراق بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ نئی سوچ اور افکارِ تازہ اپنی قوم میں سرایت کرنے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اقبالؒ تاریخ کے انہی اوراق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ترکوں (سلطنتِ عثمانیہ) کی بربادی دراصل بربادی نہیں بلکہ جہانِ تازہ میں ایک نئی چنگاری ہے جو آگے جا کر تاریخ ساز تحریک کا شاخسانہ بنے گی۔ یہ شعر اقبالؒ کی اس بصیرت کا مظہر ہے جس میں وہ تاریخ کے زوال کو محض انجام نہیں بلکہ نئی صبح کی تمہید سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تقدیر مادی سلطنتوں یا محلات میں نہیں بلکہ ان کے زندہ افکار میں پوشیدہ ہے۔ جب کوئی تہذیب یا سلطنت زوال کا شکار ہوتی ہے تو بظاہر یہ المیہ لگتا ہے، لیکن دراصل یہ انہی قربانیوں کا مرحلہ ہوتا ہے جو ایک نئے دور

کے آغاز کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی تصور اقبالؒ نے "جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود" میں بیان کیا تھا، اور اسی کو یہاں قربانی اور آزمائش کے تناظر میں سمجھایا ہے۔

تاریخ بھی اقبالؒ کی اس بصیرت کی تائید کرتی ہے۔ سقوطِ بغداد کے وقت عباسی خلافت کے زوال نے بظاہر عالمِ اسلام کو اندھیروں میں دھکیل دیا، مگر اسی تباہی کے بطن سے اندلس اور بعد میں عثمانی سلطنت نے جنم لیا۔ اسی طرح سلطنتِ عثمانیہ کا ٹوٹنا بظاہر ایک کوہِ غم تھا، لیکن یہی زوال آگے چل کر تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ خلافت اور برصغیر کی تحریکِ آزادی کا محرک بنا۔ ترکوں کی جنگِ آزادی بھی اسی خونِ صد ہزار انجم کا نتیجہ تھی جس سے ایک نئی سحر نے جنم لیا۔ اقبالؒ کا پیغام یہ ہے کہ قوموں کی تاریخ میں شکست، قربانی اور کرب کے مراحل لازمی ہیں۔ مگر وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اس اندھیرے کو اپنی صبح کا مقدمہ بنالیتی ہیں۔ اس لیے عثمانیوں کا زوال یا ترکوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹنا محض ناکامی نہیں، بلکہ ایک ایسے جہانِ تازہ کی نوید ہے جس کی بنیاد نئی فکر اور زندہ شعور پر رکھی جائے گی۔

یوں "جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود" اور "خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" ایک ہی پیغام دیتے ہیں۔ دنیا افکار سے بنتی ہے، اور یہ افکار قربانی کے بغیر جنم نہیں لیتے۔ اقبالؒ کا یہ تصور دراصل ایک انقلابی فلسفہ ہے کہ شکست کو انجام نہیں بلکہ نئی زندگی کی شروعات سمجھا جائے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری [8]

اقبالؒ کی شاعری دراصل ایک تاریخی تسلسل کی صدا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ماضی کی عظمت کو رونا کافی نہیں۔ یونان کی فلسفیانہ روایت، بغداد کے بیت الحکمہ کی علمی فضا، اندلس کی علمی روشنی، یہ سب اس وقت پیدا ہوئے جب انسان نے جمود کو توڑا اور نئی فکر کی بنیاد رکھی۔ لیکن جب یہی اقوام جمود کا شکار ہوئیں تو تاریخ نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اسی فلسفے کو اقبالؒ نے اپنی شاعری میں جابجا بیان کیا۔ وہ بار بار یاد دلاتے ہیں کہ "جہانِ تازہ" کی بنیاد پتھر اور اینٹ پر نہیں بلکہ فکر کی تازگی پر ہے۔

اقبالؒ کی شاعری میں انقلابی رنگ بھی اسی "فکرِ تازہ" کی وابستگی آیا، گویا اقبالؒ اس بات کے قائل تھے کہ مسلمان دنیا میں غلام بن چکے ہیں، مگر ان کے اندر ابھی ایک چنگاری زندہ ہے۔ وہ اس چنگاری کو شعلہ بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ہمیں مایوسی کے بجائے ولولہ ملتا ہے۔ وہ امت کو بتاتے ہیں کہ زوال عارضی ہے، بشرطیکہ ہم اپنی سوچ کو تازہ کریں۔ افکارِ تازہ دراصل حیاتِ نو کی کنجی ہیں۔ وہی فکر جو انسان کو پرانے سانچوں سے آزاد کرے، سوال کرنا سکھائے، اور نئی دنیا کے خواب دکھائے۔ وہ فکر جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ دے اور انسان کو اپنی حقیقت پہچاننے کا حوصلہ دے۔ اقبالؒ کے اشعار صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا ایک نئے عہد میں داخل ہو رہی ہے۔ مشینوں کا دور شروع ہو چکا تھا، قومیں بیدار ہو رہی تھیں، اور نئے انقلابات جنم لے رہے تھے۔ ایسے میں اگر مسلمان پیچھے رہ گئے تو یہ ان کا اپنا خسارہ ہوگا۔ اقبال کے اس انقلابی رنگ اور مشرق کی بیداری کے بارے میں نکلسن کی رائے:

"اقبال کی شاعری نے نوجوان مسلمانوں میں بیداری پیدا کر دی ہے اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جس مسیحا کا انتظار تھا وہ آگیا ہے۔" [9]

اقبال کی اسی انقلابی مسیحائی کے بارے میں شمس العلماء، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری رقم طراز ہیں:

"اقبال ہمارے لیے مسیح بن کر آیا ہے اور اس نے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔"[10]

یوں اقبالؒ کے نزدیک "افکارِ تازہ" صرف ایک فکری تجویز نہیں بلکہ عملی زندگی کا زادِ راہ ہیں۔ یہ افکار ہی وہ سرچشمہ ہیں جو قوموں کو اندر سے توڑنے والی غلامانہ ذہنیت کا علاج فراہم کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک ایک مردہ دل اور جمود کا شکار قوم کو اگر زندہ کیا جا سکتا ہے تو صرف اسی تازہ فکر کے ذریعے، جو انسان کو اس کی پوشیدہ صلاحیتوں سے روشناس کرائے اور اس میں خودی کا شعور بیدار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بار بار وہ ولولہ اور صدا سنائی دیتی ہے جو مایوسی کے اندھیروں کو چیر کر نئی صبح کا پیام لاتی ہے۔ اقبالؒ سمجھتے تھے کہ دنیا کی اصل طاقت توپ و تفنگ یا سرمایہ نہیں بلکہ وہ انقلابی فکر ہے جو دلوں میں یقین، اذہان میں روشنی اور زندگی میں حرارت پیدا کر دے۔ ان کی آواز دراصل ہر اس فرد کے لیے دعوتِ عمل ہے جو اپنے حال پر قانع نہیں بلکہ مستقبل کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اقبالؒ مسلمانوں کے حالاتِ حاضرہ میں فکری اور عملی جمود کو بھانپ چکے تھے اور اس کے حل سے واقف تھے اسی لیے اپنے معاصرین سے مخاطب ہو کر کہا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں[11]

علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری کا مجموعی مزاج یہی ہے کہ اقبالؒ اپنی قوم کو متنبہ ضرور کرتے ہیں، اسے تاریخ کی حقیقت، حال کی کڑواہٹ اور مستقبل کی پیشن گوئیوں سے بھی روشناس کراتے ہیں لیکن امید کا پہلو اقبال کے ہاں ہر حالت میں پایا جاتا ہے وہی امید یہاں پر بھی کارفرما نظر آتی ہے گویا اقبال کو اپنی قوم میں افکارِ تازہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس جھلک کو عملی طور پر مسلم قوم کی روزمرہ حیات میں شامل دیکھنا چاہتے ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبالؒ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی[12]

اقبالؒ کی فکر کا مطالعہ ہمیں ایک ایسی بصیرت عطا کرتا ہے جو محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے لیے عملی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے۔ اگر ہم اس طویل تاریخی سفر پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ایک بنیادی حقیقت صاف دکھائی دیتی ہے کہ قوموں کا عروج یا زوال محض سیاسی قوت یا معاشی ترقی سے وابستہ نہیں بلکہ اس کا اصل سرچشمہ فکر و شعور ہے۔ بغداد کے بیت الحکمہ کی روشنی، اندلس کی درسگاہوں کی تابانی اور عثمانی سلطنت کی عظمت، اس وقت تک زندہ رہیں جب تک ان کے دل و دماغ تازہ افکار سے روشن رہے۔ جیسے ہی جمود اور ذہنی غلامی نے جگہ لی، عظمت کے مینار بھی مٹی میں مل گئے۔

اقبالؒ کے نزدیک یہ حقیقت محض ایک تاریخی سبق نہیں بلکہ ایک زندہ اصول ہے۔ وہ قوموں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وقت کی دھارے کو محض عمارتوں، ہتھیاروں یا سرمایہ کے بل پر نہیں موڑا جا سکتا۔ اصل تبدیلی اُس لمحے جنم لیتی ہے جب فرد اپنے اندر سے بیداری محسوس کرتا ہے، جب وہ سوال کرنے کی جرات رکھتا ہے اور جب وہ اپنے یقین کی بنیاد پر عمل پیہم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اقوام کی تعمیر ہوتی ہے۔

عہدِ حاضر میں اگر ہم اپنے معاشرتی اور تہذیبی تناظر پر نظر ڈالیں تو ہم خود کو ایک بار پھر اسی موڑ پر پاتے ہیں جہاں ماضی کی قومیں کھڑی تھیں۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی، مغربی تہذیب کی کشش، اور معاشی و سیاسی عدم استحکام نے مسلم دنیا کو ایک کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایسے میں سوال یہ ہے کہ ہماری اصل قوت کہاں سے آئے گی؟

اقبالؒ کا جواب واضح ہے۔ یہ قوت باہر سے نہیں بلکہ ہمارے اپنے اندر سے ابھرے گی۔ اگر ہم اپنی فکری آزادی کو بحال کرلیں، اجتہاد کے دروازے کھولیں اور اپنی خودی پر اعتماد پیدا کرلیں تو کوئی طاقت ہمیں ترقی کی شاہراہ پر چلنے سے روک نہیں سکتی۔ اقبالؒ کی شاعری ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ مایوسی کی کیفیت دراصل غلامی کی سب سے بڑی شکل ہے۔ جو قوم اپنے حال پر قانع ہو کر مستقبل کے خواب دیکھنے کی جرات نہ رکھے، وہ تاریخ کے دھارے سے باہر ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو قوم اپنی کمزوریوں کا ادراک کرتی ہے، اپنے زوال کو تسلیم کرتی ہے اور پھر اس زوال کو نئے سفر کا نقطہ آغاز بناتی ہے، وہی حقیقی معنوں میں زندہ قوم کہلاتی ہے۔ اس عمل میں قربانی ناگزیر ہے، مگر یہی قربانیاں مستقبل کے چراغ جلاتی ہیں۔

اقبالؒ کا کلام اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ "افکارِ تازہ" صرف فرد کی نہیں بلکہ اجتماعی شعور کی ضرورت ہیں۔ اگر کوئی نوجوان سوال کرنے کی جرات کرتا ہے تو وہ اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی سوچ پورے معاشرے میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں فرد اور قوم ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ اقبالؒ چاہتے تھے کہ ہر مسلمان اپنے اندر یہ اعتماد پیدا کرے کہ وہ اپنے رب کے سہارے سے اپنی تقدیر خود لکھ سکتا ہے۔ یہی خوداعتمادی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا پہلا قدم ہے۔ یوں اقبالؒ کی فکر ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ جہانِ تازہ کی نمود افکارِ تازہ سے ہی ممکن ہے۔ لیکن یہ افکار محض خیالات کی دنیا میں نہیں رہنے چاہئیں بلکہ عمل میں ڈھلنے چاہئیں۔ سوال کو جرات میں، جرات کو یقین میں اور یقین کو عمل میں بدلنا ہی وہ راستہ ہے جو قوموں کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ اگر ہم اس اصول کو سمجھ لیں تو ہمیں ماضی کی شکست کا ماتم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ مستقبل کی تعمیر کی خوشخبری سنائی دے گی۔ اقبالؒ کا فلسفہ دراصل امید، یقین اور عمل کا پیغام ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اگر زمین بنجر ہے تو بھی اس میں امکان موجود ہے، اگر دل و دماغ مردہ ہو گئے ہیں تو بھی ان میں بیداری کی چنگاری باقی ہے، اور اگر قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے تو بھی وہ اپنی فکری قوت سے انہیں توڑ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ اپنی کشتِ ویراں سے بھی ناامید نہیں۔ یہ پیغام آج بھی اتنا ہی تازہ ہے جتنا سو سال پہلے تھا، بلکہ آج اس کی ضرورت کہیں زیادہ ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

1- علامہ اقبالؒ، کلیاتِ اقبال، لاہور، استقلال پریس، ۱۹۹۰، ۶۱۲۔

2-ایضاً، ۳۷۹۔

3-ایضاً، ۴۷۷

4-ایضاً، ۹۸

5-ایضاً، ۳۰۲

6- ایضاً۔

7-ایضاً، ۲۹۸

8-ایضاً، ۴۱۷

9- ایضاً، ۱۰

10- ایضاً، ۱۱

11-ایضاً، ۵۹۵

12-ایضاً، ۳۵۱

❖❖❖